بیار فلاح و نجات

آج کل یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ انسان کے لیے فلاح و نجات کے لیے بس یہ کافی ہے کہ وہ عملی حیثیت سے اچھا آدمی ہو۔ مثلاً جھوٹ نہ بولتا ہو۔ دیانتدار ہو، خیانت نہ کرتا ہو، انصاف پسند ہو، ظلم و تعدی سے پرہیز کرتا ہو، امن پسند ہو، فتنہ و فساد سے علیحدہ رہتا ہو۔ یہ سب اچھے اوصاف جس میں ہوں وہ نجات کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ کسی عقیدہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ کو ایک مانو۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خدا کا رسول سمجھو۔ آخرت کو تسلیم کرو، قیامت کا یقین کرو۔ غرض کہ دین کے ساتھ جو ایک دنیا معتقدات کی وابستہ کر دی گئی ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ خیال اگر قرآن اور حدیث سے بالکل بیگانہ اشخاص کی طرف سے پیش ہوتا تو اس پر بحث دوسری طرح ہونا چاہیئے تھی مگر چوں کہ یہ خیال کچھ مذہبی حلقوں میں بھی پایا جاتا ہے اس لیے اس پر بحث کے سلسلہ میں سب سے پہلے قرآن سے فیصلہ طلب کرنا مناسب ہوگا۔ جب ہم قرآن پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ قرآن نجات کے لیے ایمان اور عمل صالح دونوں کی ضرورت بتلاتا ہے۔

علاوہ اُن کثیر التعداد آیتوں کے جہاں مجمل طور پر نعیم اخروی کے وعدوں میں ایمان اور عمل صالح کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ کافی تفصیل سے کام لیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

لیس البرّ ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکنّ البرّ من آمن باللہ والیوم الآخر والملٰئکۃ والکتاب والنبیین وآتی المال علی حبہ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ وآتی الزکوٰۃ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصابرین فی الباسآء والضرّآء وحین الباس اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون۔

(بقرہ)

اس کا واضح خلاصہ یہ ہے کہ نیک آدمی ہونا صرف کسی ایک طرح کے عمل سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اللہ اور روز آخرت وغیرہ پر ایمان ہو اور پھر عمل صالح ہو جس کی ایک فہرست پیش کر دی ہے جس میں حقوق اللہ بھی ہیں اور حقوق الناس بھی۔ اور یہ سب باتیں اُو۔ اُو کے ساتھ نہیں ہیں جس کے معنی یہ ہوتے۔ کہ یا ایمان ہو یا خیرات ہو یا نماز ہو۔ اس صورت میں ان میں سے ایک بات اگر ہوتی تو نیک آدمی ہونے کے لیے کافی ہوتی مگر یہاں تو وہ سب باتیں و۔ و۔ و کے ساتھ بیان کی ہوئی ہیں جس کے معنی ہماری اُردو زبان میں اور۔ اور۔ اور۔ کے ہوتے ہیں اس کا تقاضا ہے اجتماع اوصاف۔ کہا جا رہا ہے کہ نیک آدمی ہونے کا معیار ہے اللہ اور روز آخرت وغیرہ پر ایمان اور نماز کا قائم رکھنا اور زکوٰۃ دینا وغیرہ وغیرہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام اوصاف کو نیک ہونے میں دخل ہے۔ ان میں سے بعض ہوں اور بعض نہ ہوں تو نیکی کا مصداق حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر کوئی بڑا صاحب ایثار ہے اور دوسروں کے دکھ درد میں کام آتا ہے۔ سچ بولتا ہے۔ کسی کو آزار نہیں پہونچاتا مگر عقیدہ کچھ نہیں رہتا۔ ایمان نام کی کوئی چیز اس کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں نہیں ہے تو قرآن کے رو سے وہ نیک آدمی نہیں ہے اور اُس حسن انجام میں بھی اس کا حصہ نہیں ہے جس کا قرآن نے نیک آدمیوں کے لیے اعلان کیا ہے۔

اب آئیے عقلی طور پر غور کریں کہ حسن عمل کے ساتھ حُسنِ اعتقاد یا ایمان کی ضرورت کیا ہے اور اہمیت کس لیے ہے؟

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ افعال و اعمال انسان کے اعضاء و جوارح سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اعتقادات اُس کے دماغ و ذہن سے۔

اگر انسان فاعل مختار نہ ہوتا۔ اُس کے افعال بالطبع ہوتے، بالارادہ نہیں تو اس کے افعال میں نیت و ضمیر کا دخل اور دماغ و ذہن سے اُن کا ربط نہ ہونا ٹھیک تھا مگر انسان کا کمال تو اس کے جوہر اختیار میں مضمر ہے اور اختیار نفس سے متعلق ہے جس کی کارفرمائی ذہن و دماغ کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

بغیر کسی عقیدہ کے مشق و عادت سے عمل ہو سکتا ہے۔ جیسے ایک ماں باپ نے ابتدائے عمر سے بچہ کو نماز پڑھنا سکھایا تو ماں باپ نے یہ ایک عادت ڈال دی ہے کہ ادھر صبح نمودار ہوئی اور فوراً اس کی آنکھ کھل گئی۔ اٹھا اور نماز پڑھی۔ ظہر و عصر کا وقت ہوا اور یہ مسجد میں پہونچ گیا نماز پڑھ لی۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کے وقت۔ یہ ماں باپ نے ایسی عادت ڈال دی ہے کہ نماز کا وقت آتے ہی یہ بیچین ہو جاتا ہے۔ جب تک نماز پڑھ نہیں لیتا طبیعت بے قرار رہتی ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا اور معلوم ہوتا ہے ایک بوجھا ہے سر پر جسے اتارنا ضروری ہے لیکن اگر یہ عبادت صرف بر بنائے عادت ہے تو اس کا اثر نماز ہی کی حد تک رہے گا، اس کے دوسرے کردار پر اثر نہیں پڑے گا۔

جیسا کہ بہت سے نمازیوں میں روزمرہ کا مشاہدہ ہے اور اسے اس دور میں مذہب اور پابندی مذہب کے خلاف بطور اعتراض پیش کیا جاتا ہے کہ وہی جو نماز کا اتنا پابند ہے۔ اگر کسی کا پیسہ اس کے ذمہ واجب الادا ہو تو یا اس کی ادائی کے لیے یا کسی کی امانت اس کے پاس ہو تو اُس کی بحفاظت واپسی کے لیے ایسا بےچین نظر نہیں آتا مگر در حقیقت یہ اسی وجہ سے ہے کہ اس کی عبادت عادت کا نتیجہ ہے اس میں وہ روح نہیں ہے جس کا قربتہً الی اللہ کے الفاظ جو نیت نماز میں اُس نے سیکھے ہیں تقاضا رکھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ عادت ایسی چیز ہے جو انسان کو کسی کار خیر کا پابند بنا سکتی ہے مگر مشق و عادت کا نتیجہ جزئی ہوگا۔

اسی صورت سے کسی کو ماں باپ کی تربیت یا کسی اچھے ماحول کے اثر سے سچ بولنے کی مشق ہو گئی ہے۔ یہ سچ بولنے کی عادت چونکہ زبان سے متعلق ہے لہٰذا زبان اس کی پابند ہو جائے گی۔ مگر اسی زبان سے یہ کسی کی دل آزاری نہ کرے۔ اس زبان سے یہ چغلی نہ کھائے۔ اس زبان سے اشتعال انگیزی کر کے یہ فساد نہ کرائے۔ یہ سب اُس مشق کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔

پھر سچ بولنے کی اسے عادت ہے تو یہ اس سچ کے محل کو دیکھے اور اُس کے نتائج پر غور کرے ایسا نہیں ہوگا۔

اب اگر کسی نے دوسرے کو گالیاں دیں اور اُس نے اپنی سچ کی عادت کی بنا پر اس دوسرے

سے بالکل ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا کہ فلاں نے تم کو یہ کہا ہے تو بہت ممکن ہے یہی سچ ایک بڑی خونریزی کا سبب بن جائے اسی طرح متعدد گناہان کبیرہ ہیں جو سچ ہی سے عالم وجود میں آتے ہیں۔ وہ سچ بولنے کی عادت ان گناہوں سے بچا نہیں سکتی بلکہ وہی ان گناہوں کی محرک ہو سکتی ہے۔
اسی طرح ہر کام جو عادت کی بناء پر وقوع میں آئے وہ یقیناً محدود حیثیت رکھے گا اور انسان کی پوری زندگی پر اثر انداز نہیں ہوگا۔
حقیقتہً تمام اعضاء انسانی پر جو حکمراں ہے وہ نفس ہے۔ اعضاء کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر فعل الگ ہے اور فاعل بھی الگ الگ ہیں۔
مثلاً دیکھنا آنکھوں کا کام ہے، پیروں سے کوئی تعلق نہیں۔ چلنا پیروں کا کام ہے، کان سے کوئی تعلق نہیں ہے ——— وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ تمام افعال نفس کی منزل میں جا کر سمٹ جاتے ہیں۔
دیکھا آنکھوں نے مگر یہ شخص کہیگا میں نے دیکھا۔ سنا کانوں نے وہ کہیگا میں نے سُنا۔ اٹھایا ہاتھ نے مگر وہ کہیگا میں نے اٹھایا۔
معلوم ہوا کہ نفس انسان وہ ہے جو تمام اعضاء پر حاوی ہے اب اگر کوئی چیز نفس پر اپنا اثر قائم کر دے تو اس کے بعد اعضاء کو الگ الگ مشق کرانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہی نفس کا تاثر تمام اعضاء کو پابند بنا دے گا۔ اعتقاد و ایمان وہی چیز ہے جو براہ راست نفس پر اپنا سکہ جماتا ہے اور جب ایمان نے نفس کو مسخر بنا لیا تو ایک سانچا کردار کا بن گیا جس میں ڈھل کر تمام افعال ضبط و نظام کی پابندی کے ساتھ، بلند مقاصد کے تحفظ کی نگہداشت کے ساتھ ہوں گے اس سانچے کا نام قرآنی اصطلاح میں "تقوے" ہے اور وہ بغیر ایمان وجود میں آہی نہیں سکتا۔
حقیقت امر یہ ہے کہ بغیر اعتقاد کے عمل کے لیے کوئی پس منظر مہیا نہیں ہوتا جیسے عمارت ہو اور اُس کی کوئی بنیاد نہ ہو۔ درخت ہو اور اُس کی جڑیں نہ ہوں۔
عقائد اور اعمال کے لیے اصولِ دین اور فروعِ دین کی اصطلاح اسی حقیقت کی مظہر ہے جس طرح درخت کی جڑیں اندر اندر پھیلتی ہیں، اور شاخیں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔

اسی طرح اعتقادات دل و دماغ کے اندر جگہ پکڑتے ہیں اور اُن کا اثر اعضائے جسم سے افعال کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

اب اگر شاخیں نظر نہ آئیں تو یقین کرنا چاہیئے کہ اصل کمزور ہے کیوں کہ اگر اصل طاقتور ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ شاخیں نمایاں نہ ہوں۔

جب شاخیں مفقود ہیں یا ہیں لیکن خشک ہیں تو ان شاخوں کے ہرا کرنے کے لیئے شاخوں کو پانی سے بھگویا نہیں جائے گا بلکہ جڑ کو پانی دیں گے۔ اسی سے شاخیں تر و تازہ ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح ہم میں اگر عملی کمزوریاں ہیں تو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہمارا ایمان مستحکم ہے بلکہ یہ درحقیقت عقائد ہی کی کمزوری ہے جو اعمال میں کوتاہی کی باعث ہے۔

اسی طرح اگر اصل موجود نہ ہو اور صرف شاخیں تر و تازہ نظر آئیں تو یہ شاخیں یقیناً نمائشی ہوں گی۔ وہ اس درخت کی شاخیں ہی نہ ہوں گی۔ نہ وہ مستحکم ثابت ہو سکتی ہیں۔ جب تک کسی تیز آندھی کا جھوکا نہیں آیا۔ یہ شاخیں قائم ہیں اور ادھر کوئی تیز آندھی چل گئی، انقلاب کا کوئی طوفان آگیا اور بس یہ شاخیں غائب ہو گئیں۔

ان نمائشی شاخوں سے رونق چمن ہو سکتی ہے اور ایک محدود وقت تک اُن کا سایہ باعث آرام بھی ہو سکتا ہے مگر ان شاخوں سے ثمر ملنا غیر ممکن ہے۔ ثمرہ اُن ہی شاخوں سے حاصل ہو سکے گا جو اصل سے متصل ہوں۔

یہی تعلق عقائد و اعمال کا باہمی ہے۔ اگر اعمال نہیں ہیں تو ایمان یا تو ہے ہی نہیں اور یا ہے تو اتنا کمزور کہ حیات میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا اور اعمال اگر بغیر صحیح عقائد کے ہیں تو وہ وقتی ہیں۔ ان میں کوئی پائداری نہیں اور ان سے ثمرۂ نجات حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ اعمال یا بطور عادت ہیں یا کسی حکمت عملی سے بطور نمائش ہیں۔ لہٰذا اُن پر اعمال صالحہ کا اطلاق بھی واقعتہً درست نہیں ہے۔

ہاں اگر ایمان ہو اور کردار اُس کے مطابق ہو تو وہ اس شخص کے لیے بھی نتیجہ خیز ہے اور دوسروں پر بھی اثر انداز۔

ایمان تو دل کے اندر کی چیز ہے وہ بذاتِ خود دوسروں کو متاثر نہیں بنا سکتا۔

کا اصول کہنا چاہیئے جس کو آج کل کے متضاد نظریہائے فکر کے درمیان بطور ایک نباہ کی شکل کے امن عالم کے مفاد کے لیے تجویز کیا گیا ہے مگر وہ چودہ سو برس پہلے قرآن پیش کر چکا ہے۔ اپنے اس مستقل ایک سورہ میں جو "سورۂ کافرون" کے نام سے موسوم ہے جس کا مرکزی مقصد اُس کے آخری جملہ میں مضمر ہے کہ "لکم دینکم ولی دین"

یہ طریقہ اُن مذاہب پر بھی حاوی ہے جن کا کسی رہنمائے حق سے کوئی علاقہ نہو اور جن میں دین صحیح کے ساتھ کوئی نقطۂ مشترک نہ ہو تو ان کو آپس میں اسی بنیاد پر سمجھوتا کرنا چاہیئے ایک دوسرے کے ساتھ تعرض نہ کرے اور اگر افہام و تفہیم کے ذریعہ سے ایک نقطہ پر جمع ہونا ممکن نہ ہو تو پرامن طریقہ پر زندگی گزارنے کے لیے لازمی یہی صورت اختیار کرنا پڑے گی جسے صحیح حد و میں سیکولر نظام کی بنیاد بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔